سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن، لکھنؤ ۵۶۷

سرِّ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ

یا

معنیٔ ذبحِ عظیم

از۔ افادات

آیۃ اللہ العظمیٰ الحاج مولانا

سید علی نقی النقوی

طاب ثراہ

قیمت 2.00

پیش لفظ

سید العلماء طاب ثراہ کا زیر نظر رسالہ اگرچہ مختصر ہے لیکن ایک بڑے موضوع پر محیط ہے۔ اسکو جس خوبی اور بلاغت سے قلم بند کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

بلا شبہ یہ رسالہ ارباب علم اور اہل نظر کے لیے سرمہ بصیرت کی حیثیت رکھتا ہے۔

رسالہ کو زیادہ سے زیادہ مومنین و مسلمین تک پہونچانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اسے مرحوم اعزا و اقربا کے ایصال ثواب کی غرض سے مجالس ترحیم میں بطور تبرک تقسیم کیا جائے۔

الداعی الی الخیر
عابد طبا طبائی
سکریٹری۔ امامیہ مشن۔ لکھنؤ

رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ

تعارف

عشرۂ محرم ۱۳۸۷ھ میں جب سرکار سید العلماء مدظلہ العالی شمس آباد ضلع فرخ آباد تشریف لائے تو بانیان مجالس نواب سید احمد عباس صاحب صفوی پرنسپل پالی ٹیکنک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، نواب سید علی جعفر صاحب موسوی پرنسپل انٹر کالج شمس آباد اور نواب سید محمد صادق صاحب صفوی نے سرکار مولانا کے بیانات کو ٹیپ رکارڈنگ سے محفوظ کر لینے کا انتظام کیا۔ چنانچہ ۵ محرم کی صبح کی مجلس اور اسی دن شب کی مجلس محفوظ کر لی گئی۔ اول الذکر مجلس جب دوبارہ ٹیپ رکارڈ کو مصروف کلام کر کے سُنی جا رہی تھی تو مجھ کو یہ خیال آیا کہ یہ مجلس کیوں نہ شائع ہو کر عام افادیت کا سبب بنے۔ اور ٹیپ رکارڈ کے علاوہ کتابی شکل میں بھی محفوظ ہو جائے، چنانچہ میں نے کوشش کی کہ اس مجلس کو دوران سماعت لکھتا جاؤں جو صاحبان ذوق کے استفادہ کے لیے حاضر ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نقلِ بیان۔ وہ بھی شارٹ ہینڈ کی وساطت کے بغیر اُس زور کلام اور اُس موثر انداز خطابت کا قطعاً حامل نہیں ہو سکتا جو سرکار سید العلماء مدظلہ کی منفرد خصوصیت ہے۔ تاہم نفس موضوع اور تسلسل بیان قائم رکھنے کی سعی ضرور کی گئی ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ سرکار سید العلماء دام ظلہ کے مواعظ و بیانات اور تصانیف و ارشادات نے فکر و نظر کے لیے جو نئی راہیں کھولی ہیں اور

ہماری مذہبی خطابت کو جس معراجِ کمال تک پہونچا دیا ہے وہ ایک حقیقت مسلّمہ ہے۔ اس کے علاوہ سرکار موصوف کے ارشادات اپنی رفعت بیان، بے پناہ قوتِ استدلال اور ہمہ گیر تاثیر کے ساتھ ساتھ تقریر اور تحریر دونوں میں ادبی شاہکار کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

یہ جامع اور منفرد خصوصیات اور تحریر و تقریر کی ادبی رعنائیں صحیح معنی میں ایک مبسوط اور مستقل تصنیف کی مستحق ہیں جو نہ صرف آئندہ نسلوں کے لیے ہماری مذہبی خطابت کی تاریخ اور منازلِ ارتقا کے لیے ایک یادگار ہو بلکہ زبان و ادب کے لحاظ سے سرکار ممدوح کے خصوصیات بھی محفوظ ہو جائیں۔ کاش ادبائے ملت اس طرف توجہ فرما کر قوم پر احسان فرمائیں۔

ننگِ وجود

ظہور حسین رضوی

فرخ آباد

۲۴ اپریل سنہ ۱۹۶۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین ابی القاسم محمد خاتم النبیین و الہ الطیبین الطاہرین اما بعد فقد قال اللہ سبحانہ فی کتابہ المبین

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ﴿١٠٢﴾ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ﴿١٠٣﴾ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٠٥﴾

(سرورق پر: الصّٰلحین ﴿١٠٠﴾ فبشرنٰہ بغلٰم حلیم ﴿١٠١﴾)

قرآن مجید نے بغیر نام لیے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کے فرزند کی قربانی کا تذکرہ کیا ہے۔ ان آیات کے ذیل میں جن کی تلاوت میں نے کی ہے چونکہ نام مذکور نہیں ہے اس لیے کچھ علمائے اسلام میں بھی یہ چیز محل بحث ہو گئی ہے کہ یہ قربانی کا تذکرہ اسحٰقؑ سے متعلق ہے یا اسمٰعیلؑ سے۔ مگر علمائے اسلام کے درمیان یہ اختلاف ہلکا ہے۔ کم علماء ہیں جو اس قربانی کو اسحٰق سے متعلق قرار دیتے ہوں۔ مگر حقیقت میں یہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کا اختلاف ہے کہ یہود و نصاریٰ اس قربانی کو اسحٰق کی قربانی قرار دیتے ہیں اور علمائے اسلام اسمٰعیل کی۔

علمائے اسلام میں کیوں اختلاف ہوا؟ وہ اس بنا پر کہ اس تذکرہ کے شروع میں ان آیات سے پہلے بشارت کا ذکر ہے:۔

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ "ہم نے انھیں ایک متحمل و بردبار لڑکے کی بشارت دی"۔

چونکہ دوسرے مقامات پر یہ بشارت صراحتہً جناب اسحاق سے متعلق ہے۔ فرشتے آئے اور انھوں نے جناب ابراہیم سے کہا:۔ "اَنَا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ"۔ اسی سلسلے میں ایک جگہ ہے:۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ٥ قَالُوْا كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ ط اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ٥

جب جناب ابراہیم کو ایک دانش مند لڑکے کی بشارت دی گئی تو ان کی بیوی جناب سارہ نے جو ضعیف العمر بھی تھیں اور عقیم بھی سمجھی جا چکی تھیں اپنا منھ پیٹ لیا۔ اب چونکہ یہ بشارت جس کا کئی جگہ قرآن مجید میں تذکرہ ہے بلاشبہ جناب اسحٰق سے متعلق ہے تو یہ خیال ہوا کہ وہاں بھی بشارت کا ذکر جناب اسحٰق سے متعلق ہے اور اسی سلسلے میں قربانی کا تذکرہ ہے تو وہ بھی جناب اسحٰق ہی سے متعلق ہوگا مگر یہ تصور درست نہیں ہے اور یہ استدلال کوئی مضبوط بنیاد رکھتا ہے۔

آخر یہ سیاق کلام ہی کی بنا پر تو کہا جا رہا ہے کہ چونکہ پہلے بشارت کا ذکر ہے لہٰذا یہ قربانی بھی اسحٰق سے متعلق ہونا چاہیئے لیکن اگر سیاق دیکھنا

کے تذکرہ کے بعد پھر یہ آیت آتی ہے :-

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ؁

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق (کے پیدا ہونے) کی (بھی) خوشخبری دی۔

اس سیاق سے صاف ظاہر ہے کہ پہلی بشارت اُس فرزند کی تھی جس سے قربانی کا تعلق ہے اور پھر اس بشارت کا ذکر ہے جو جناب اسحاق سے متعلق ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی کیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ تو مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا ہوا مگر علمائے اسلام اور اہل کتاب کے درمیان قرآن سے فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے بائبل کو دیکھیے۔

عہد نامۂ قدیم میں فرزند جناب ابراہیمؑ کی قربانی کا ذکر موجود ہے۔ اصل بائبل کا تو پتہ نہیں ہے لیکن جس زبان میں یہ شائع ہوتی ہے بائبل ہی کہلاتی ہے۔ بائبل میں قربانی سے پہلے حضرت ابراہیم کی ایک مناجات مذکور ہے۔ اس کے تذکرے سے پہلے ایک حقیقت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، جو اہل کتاب کے درمیان بھی مسلّم ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسمٰعیلؑ بڑے بھائی تھے۔ تیرہ برس اسحاقؑ سے بڑے تھے۔ جب اسمٰعیلؑ تیرہ برس کے ہوئے تب اسحاقؑ کی ولادت ہوئی۔ اب بائبل میں دیکھیے کہ ابراہیم نے قربانی پیش کرنے سے پہلے عرض کیا کہ پروردگار! میں اپنا اکلوتا بیٹا تیری بارگاہ میں پیش کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ چھوٹا بھائی اکلوتا کسی منزل میں نہیں ہوتا۔ بڑا بھائی اکلوتا رہتا ہے، جب تک چھوٹا پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ قربانی اسمٰعیل سے متعلق ہو سکتی ہے، اسحاق سے نہیں۔

یہ تو منقولی فیصلہ تھا مگر آج کل درایت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو اگر یہ قربانی اسحاق سے متعلق ہوتی تو یہود و نصاریٰ کے یہاں اسکی یادگار ہوتی مگر ان کے مذہبی رسوم میں اسکی کوئی یادگار نہیں ہے۔ مگر ملت اسلامیہ کے اندر مراسم حج میں قربانی کی یادگاریں ہیں، ترویہ، عرفہ دونوں کے نام ظرف زمان کی یادگار اور عرفات و منیٰ ظرف مکان کی یادگار ہیں۔

"ترویہ"

کے معنی غور و فکر کے ہیں۔ یعنی یہ وہ دن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خواب دیکھ چکے تھے۔ اور اب طریق کار کے متعلق غور و فکر فرما رہے تھے۔

"یوم عرفہ" وہ دن جب طریق کار متعین ہوا۔

"عرفات" وہ جگہ جہاں اس طریق کار کا تعارف ہوا اور منیٰ وہ سرزمین جہاں یہ قربانی پیش کی گئی اور یہی وہ سرزمین ہے جہاں حاجیوں کو قربانیاں کرنا ہوتی ہیں۔ یہ یادگاریں تمام سرزمین مکہ پر قائم ہیں۔ اور تاریخ اسلام میں موجود ہیں جو تاریخ عیسائیت میں نہیں ملتیں۔ مگر یہ اختلاف قربانی کی قدر و قیمت کا ثبوت ہے۔ دنیا اس کو شریک کرتی ہے اور اس کو اپنانا چاہتی ہے۔ اس کے بعد بڑی بدقسمتی ہوگی جمہور اہل اسلام کی کہ ایک عظیم ترین قربانی اُن کے یہاں موجود ہے جو حسینؑ کی قربانی ہے۔ اور پھر بعض حلقوں کی طرف سے اسکی یاد مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اب اس بحث کے طے ہونے کے بعد کہ یہ قربانی کس سے متعلق ہے، آیت کا ایک ایک جز پیش کیا جاتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم نے ابراہیم کو بشارت دی ایک غلام

حلیم کی۔ جب یہ فرزند دوڑ دھوپ کے قابل ہوا یعنی ایسا ہو گیا کہ باپ کی مدد کر سکتا ہے؛ اس کے کام سرگرمی سے انجام دے سکتا ہے تو کیا ہوا؟

اب یہ اعجاز قرآن مجید کا ہے کہ سیاق و سباق کے قرینہ کی بنا پر بہت سی درمیان کی کڑیاں واقعہ کی چھوڑ دی جاتی ہیں۔ دیکھا خواب ایک دن، دو دن، تین دن، مگر خواب دیکھنے کا ذکر چھوڑ دیا جاتا ہے، جب ابراہیمؑ نے بیٹے سے ان خوابوں کا حال بیان کیا تو قرآن نے وہ قول نقل کر دیا۔ اسی سے معلوم ہو جائے گا کہ خواب کئی دن دیکھے تھے۔

ابراہیمؑ نے کہا: یَا بُنَیَّ "اے میرے بچے"

اس تخاطب میں محبت کا اظہار ہے۔ محبت جو باپ کو بیٹے کے ساتھ ہے اسے تعمیل حکم میں سدِ راہ نہ ہونا چاہیے۔ لیکن حکم الٰہی اس فطری محبت کو دل سے نکالنے کا متقاضی نہیں ہے۔

اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ "میں خواب میں دیکھ رہا ہوں" اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دفعہ نہیں دیکھا ہے بلکہ کئی مرتبہ۔ کیا کہ؟

اِنِّیْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ "میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں، سوچو:

مَاذَا تَرٰی
تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں جناب ابراہیمؑ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں کہ حکم آپ کو ہے، فرزند سے رائے لینے کی ضرورت کیا ہے؟ مگر حضور! اگر ابراہیم فرزند سے رائے نہ لیتے تو قربانی کا کارنامہ ابراہیمؑ ہوتی۔ کارنامہ اسمٰعیل نہ ہوتی۔ لیکن جب فرزند سے خود مختارانہ طور پر رائے لے لی تو یہ کارنامہ اب دونوں کا ہو گیا۔

حقیقت سب کو معلوم ہے کہ خواب حکم الہٰی کی حیثیت رکھتا تھا مگر وحی بھیجنے کا جو عام طریقہ ہے اس کے برخلاف یہاں خواب دکھا دیا گیا۔ حکم اتنا شدید اور ذریعۂ حکم اتنا خفیف یعنی خواب۔ یہ بھی ایک انداز تھا امتحان قدرت کا۔ یعنی ذریعہ ایسا ہو جسے ناقص نفوس "خواب" کہہ کر ٹال سکتے ہوں، اب دنیا دیکھے کہ خلیل اس خواب کو کیا اہمیت دیتے ہیں۔ پھر خلیل بھی بیٹے سے تذکرہ کرتے ہوئے خواب ہی کہتے ہیں۔ فرمان الہٰی نہیں کہتے۔ بات یہ ہے کہ فرمان الہٰی اگر کہہ دیں تو یہ ٹکڑا بے جوڑ ہو جائے کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ جب فرمان ہو گیا تو رائے کا سوال ہی کیا؟ یہ اب بیٹے کا امتحان ہے کہ وہ باپ کے خواب کو کیا سمجھتا ہے؟ اگر وہ باپ کو صرف باپ سمجھتا ہے تو خواب کو فقط خواب سمجھے گا لیکن اگر وہ باپ کو رسول مانتا ہے تو خواب کو فرمان الہٰی سمجھے گا۔

میرے اس خیال کا کہ خالق کا خواب کی صورت سے وحی کرنا اور جناب ابراہیمؑ کا خواب ہی کہہ کر اسمٰعیل سے بیان کرنا امتحان کی غرض سے تھا۔ قرآن مجید میں شاہد موجود ہے:۔

امتحان میں ایک سوال کا پرچہ ہوتا ہے جسے معلّمین اور ارکان درس گاہ دیتے ہیں طالب علم کو اور ایک جواب کی کاپی ہوتی ہے جسے طالب علم داخل کرتا ہے۔

جناب ابراہیمؑ نے خواب دیکھا، یہ تو امتحان کے سوال کا پرچہ ہے۔ پھر جناب ابراہیمؑ نے اسمٰعیل سے مشورہ لیا، یہ بھی سوال کا پرچہ تھا۔ اب تک خواب اور بیان خواب رہا۔ لیکن جہاں سے جواب شروع ہوا، بیٹے نے نفظ بدل دی۔ اسمٰعیل نے کہا۔

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ — اے بابا جو حکم ہو رہا ہے اسکی تعمیل کیجیے

چونکہ جناب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یعنی کئی دفعہ دیکھ چکا ہوں تو اسمٰعیل نے بھی یہی کہا کہ جو حکم ہو رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو پہلی دفعہ آپ نے خواب میں دیکھا وہ بھی حکم تھا اور جو دوسری دفعہ دیکھا وہ بھی حکم تھا اور اسی طرح جو تیسری بار دیکھا۔

پھر کہتے ہیں:۔

سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ — اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیے گا۔

بلاشبہ گفتگو کا ٹھہراؤ طمانیت قلب کا پتہ دے رہا ہے۔ گھبراہٹ کے جواب کا انداز اور ہوتا ہے۔ مگر اسمٰعیل کے جواب ہی سے ظاہر ہے کہ وہ اس درجۂ رفیعہ پر بھی اس امتحان پر کامیابی کے بعد اپنے منفرد صابر ہونے کا تصور نہیں رکھتے۔ جیسے کوئی جماعت صابرین پیش نظر ہے جس سے ملحق ہو جانا اپنی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔

ابتدائے عمل کے منازل طے ہوئے۔ اب تعمیل کی منزل ہے۔ اس منزل کے لیے قرآن فرماتا ہے:۔

فَلَمَّا أَسْلَمَا "دونوں مسلم ہو کر آ گئے"۔ اس سے اسلام کی عظمت کا احساس ہونا چاہیے۔ یہ معیارِ بلندی اسلام ہے۔

وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ "اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹایا"۔

نزاکت قلب و دماغ انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے صراحتہً کیفیات قرآنی بیان نہیں کیے گئے۔ ذاکرین بیان کرتے ہیں کہ باپ نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی اور یہ محبت پدری کی بنا پر اس لیے تھا کہ بچہ کی حالت اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں۔ مجھے بھی اس کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام فطری محبت کے تقاضوں کو دور نہیں کرتا۔ حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ آنکھوں سے دیکھتے رہنے کا تو حکم نہیں ہے۔ ابراہیم اس کیفیت کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں تو کیا حرج ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ نتیجۂ امتحان کے پیش نظر آنکھوں پر پٹی باندھنے سے کارنامہ زیادہ شاندار بن گیا۔ یعنی باپ نے آنکھ بند کر کے بیٹے کے گلے پر چھری چلا دی۔ اب کون ذبح ہوا؟ اسکی ذمہ داری جناب ابراہیم پر نہیں ہے۔

عمل کی جتنی منزلیں تھیں انجام تک پہونچا دیں۔ اب ارشادِ رب ہوتا ہے۔

نَادَيْنَاهُ اَنْ يَّا اِبْرَاهِيْمُ	ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم!
قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا۔	تم نے خواب سچ کر دکھایا۔

اب یہ وہ منزل ہے جہاں اکثر ذاکرین و مقررین کے اندازِ تعبیر سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

حکم برطرف کر دیا گیا یا منسوخ ہو گیا۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے، عقلاً بھی اور از روئے قرآن بھی۔

عقلی پہلو تو یہ ہے کہ امتحان اور حکم کا تعلق افعال اختیاری سے ہوتا ہے۔ اب اگر اختیار کی حد تک کوئی بات رہ جائے تو حکم برطرف

ہوا۔ جب منازلِ عمل تمام ہو چکے تو اب حکم منسوخ ہو کر کیا کرے گا؟۔

ذبح میں افعالِ اختیاری کیا ہوتے ہیں؟

بچّہ کو لٹانا۔

ہاتھ میں ایک دھار دار آلہ لینا۔ اور گردن پر رکھنا۔

ہاتھ کو جنبش دینا تاکہ رگِ گردن قطع ہو جائے۔

یہ منزلیں ہیں عمل کی۔

کون سی بات رہ گئی جو حکم برطرف ہو؟ کیا بچہ کو لٹایا نہیں؟ کیا ہاتھ میں چھری نہیں لی؟ کیا ہاتھ کو وہ جنبش نہیں دی کہ رگِ گردن کٹ جائے؟

پھر جب حضرت ابراہیمؑ تمام منازلِ عمل اپنے حدودِ اختیار میں طے کر چکے تو اب حکم منسوخ ہو کر کیا کرے گا؟

دوسری دلیل نیم عقلی، نیم قرآنی۔

یعنی قرآن کے سہارے عقلی دلیل یہ ہے کہ یہاں حکم کوئی لفظی تو تھا نہیں جس کے مفہوم پر غور کیا جائے۔

حکم تو خواب سے مستفاد ہوا ہے۔ اب خواب کو دیکھیے کیا دیکھا تھا؟ یہ نہیں دیکھا تھا کہ ذبح کر چکا ہوں، بلکہ دیکھا یہ ہے کہ ذبح کر رہا ہوں۔ تو جو دیکھا تھا اسے عمل میں لے آئے۔

تیسرا استدلال خالص قرآنی یہ ہے کہ:۔

عمل کے بعد آوازِ قدرت کیا آئی؟ کیا یہ کہ بس بس ہم نے حکم اٹھا لیا؟ نہیں۔ بلکہ یہ کہ:

"اے ابراہیم تم نے خواب سچ کر دکھایا۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکم کی پوری تعمیل ہو گئی۔ کوئی کمی باقی نہیں رہی ایسے شاندار انداز میں یہ قربانی معرض وجود میں آئی، جبکہ ابراہیمؑ نے قربانی پیش کرنے میں اور اسمٰعیلؑ نے قربان ہونے میں کوئی کمی نہ کی تو اب خالق نے ذبح ہونے نہیں دیا۔ فدیہ بھیج دیا۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ خالق ہی کے کچھ مقاصد ان کی اس حیات سے وابستہ تھے۔ اس لیے قربانی کے معرض عمل میں آنے کے بعد نتیجہ کو روک دیا۔

ممکن ہے کہ وہ مقصد الٰہی یہ ہو کہ اسمٰعیلؑ کی اس نسل کو وجود میں آنا ہے جو قربانی کی سلسل تاریخ مرتب کرنے والی تھی۔ اس لیے اس قربانی کو وقوع میں نہیں آنے دیا گیا۔ لیکن اس سے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے کردار میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اسی لیے ذبح نہ ہونے کے باوجود لقب "ذبیح اللہ" ہو گیا۔

مسلمانوں میں اس قربانی کی یاد بھی قائم ہے۔ عید اضحیٰ یعنی عید قربان کے موقع پر اس قربانی کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ اگر آپ حج میں ہیں تو قربانی واجب ہے اور اگر وہاں نہیں ہیں تو بھی تمام عالم اسلامی کی فقہ میں مسلّم ہے کہ قربانی سنت ہے۔ یہ یادگار ہے اس قربانی کی۔

یہی وہ منزل ہے جہاں میں تمام مسلمانوں کو غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

ایک گزشتہ دور کے نبی کی ملتوی شدہ قربانی یاد رکھنے کے قابل ہو اور اپنے رسولؐ کی وقوع میں آئی ہوئی قربانی یاد رکھنے کے قابل نہ ہو کتنی افسوسناک بات ہے۔

کربلا میں ہر ایک نے وقتِ شہادت یہی آواز دی کہ یا مولاہ ادرکنی

بھتیجوں نے پکارا یا عماہ ادرکنی

عباسؑ کے علاوہ تمام بھائیوں نے پکارا یا اخاہ ادرکنی "بھائی مدد کیجیے"۔

ہر ایک نے اسی طرح پکارا اور مولا مدد کو گئے۔ مگر علی اکبرؑ جب زمین پر آئے

تو علی اکبرؑ نے لفظیں بدل دیں۔ یہ نہیں کہتے کہ یا ابتاہ ادرکنی " بابا مدد کو

آئیے۔

ایک تو ننگِ شجاعت محسوس کیا ہوگا شہزادے نے کہ جوان بیٹا بوڑھے

باپ کو مدد کے لیے بلائے۔

دوسرے یہ خیال کیا ہوگا کہ جب دوسرے شہدا بابا کو بلاتے تھے تو میں ان

کے ساتھ جاتا تھا۔ اب میں پکاروں تو حسینؑ کے ساتھ آنے والا کون رہ گیا

ہے لہذا پکار کر کہتے ہیں :۔

یا ابتاہ علیک منی السلام

مطلب یہ ہے کہ اے بابا! آنے کی زحمت نہ کیجیے۔ بس میرا اسلام

آخر قبول فرمالیجیے۔